رسائل و مسائل

بلوغت اور معاشرتی مسائل

سوال: ہمارے معاشرے میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ بلوغت کے بعد بیٹے کی معاشی کفالت والد کے ذمے نہیں' والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دیا جائے' نیز جس میں نکاح کی استطاعت نہ ہو' وہ روزے رکھے۔ اس ضمن میں چند پہلو وضاحت طلب ہیں۔

معاشی کفالت کے حوالے سے شریعت کا کیا حکم ہے؟ ہمارے معاشرے میں والد ۲۵' ۳۰ سال کی عمر تک اولاد کا بوجھ اٹھاتا ہے اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اولاد تعلیم یافتہ ہو کر اچھا روزگار حاصل کر لے اور بقیہ خاندان کو معاشی تحفظ فراہم کرے۔ کیا یہ روش غلط ہے؟ اس ضمن میں جو فرد اولاد میں سب سے بڑا ہوتا ہے' وہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس پر یہ دباؤ ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھے عہدے پر فائز ہو' اور اس کے نکاح پر بھی توجہ نہیں دی جاتی اور یہ موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے پھر نکاح کیا جائے۔ کیا تعلیم حقیقتاً گھر بسانے کی راہ میں رکاوٹ ہے اور شادی کے بعد تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہے؟

بلوغت پر نکاح سے کتنی عمر مراد ہے؟ پاکستان میں لڑکے/لڑکی کی بلوغت کی عمر بالترتیب ۱۲ تا ۱۴ سال اور ۱۱ سے ۱۳ سال ہے۔ اگر اس سے مراد یہی عمر ہے تو ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس عمر میں شادی کے بعد فرد اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کر سکے۔ اگر نکاح کے لیے استطاعت سے مراد معاشی استطاعت ہے تو اس کی کوئی حد شریعت

میں موجود ہے؟

یہاں وہ حدیث بھی پیش نظر رہے جس میں حضورؐ نے معاشی تنگی پر ایک سے زائد شادی کی ہدایت کی تھی۔ آج ہمارے معاشرے میں میڈیا کے ذریعے فحاشی و عریانی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ گناہ کے مواقع موجود ہیں۔ ان حالات میں نفس کو دبانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ ایک صورت روزہ رکھنا ہے۔ اگر طالب علموں اور ملازمت پیشہ افراد کے لیے روزہ رکھنا ممکن نہ ہو تو کیا کریں، اور روزہ تو دن میں ہوتا ہے، رات کو کیا کرنا چاہیے؟ ایک جوان آدمی جو معاشرتی روایات کے باعث نکاح نہیں کرسکتا، وہ اگر ان مخصوص حالات میں صوتی یا بصری طریقوں (موسیقی یا فلم) سے کبھی کبھار خواہش کی تکمیل کرلیتا ہو اور اس طرح ایک بڑے گناہ سے بچ جاتا ہو اور دل میں یہ احساس بھی موجود ہو کہ وہ غلط کر رہا ہے تو کیا اس صورت میں وہ گناہ کا مرتکب ہوگا؟

جواب: آپ نے اپنے خط میں تین اہم معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے۔ پہلا مسئلہ والدین پر اولاد کے حقوق سے متعلق ہے۔ قرآن کریم نے والدین اور اعزہ کے جو حقوق متعین کردیے ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ ''اپنے والدین پر خرچ کرو اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا'' (الاحقاف ۴۶:۱۵)۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں اعلیٰ سلوک و احترام کا حکم دیا گیا (۱۷:۲۳-۲۴)۔ پوری دنیا کی مساجد میں ہر صلوٰۃ الجمعہ میں خطیب قرآن کریم کی سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۰ بطور جزوِ خطبہ تلاوت کرتا ہے جس کا مفہوم ہے: اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ وغیرہ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ سورۂ نور میں رشتہ داروں کو ان کا حق نہ دینے سے روکا گیا ہے (النور ۲۴:۲۲)۔ قرآن و سنت میں موجود عمومی اور خصوصی ہدایات پر غور کیا جائے تو جس طرح اولاد پر والدین کے حقوق ہیں، اسی طرح والدین پر بھی اولاد کے حقوق ہیں جن میں ان کی اسلامی تربیت، غذا، لباس، مکان اور دیگر ضروریات کی فراہمی شامل ہے۔

بلاشبہہ عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ بلوغ طبعی کے بعد ایک اولاد اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجائے اور اولاد کو اس کی حاجت نہ رہے تو پھر والد کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ اگر والد ضرورت

کی صورت میں یا بلاضرورت بآسانی اپنی اولاد پر بلوغ کے بعد ان کی تعلیم یا دیگر ضروریات پر خرچ کرتا ہے تو شریعت اس کی تحسین کرتی ہے۔ اسی طرح اگر اولاد بلوغ تک پہنچنے پر اس قابل ہو جاتی ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے اور نہ صرف اپنے اخراجات بلکہ والدین پر بھی خرچ کر سکے تو یہ اس کے لیے سعادت ہے۔

اسلامی معاشرت میں خاندان ایک سرمایہ دارانہ معاشی یونٹ نہیں ہے بلکہ وسائل، احساسات، حقوق و فرائض اور احسان کی یک جائی پر مبنی ایک ادارہ ہے۔ اولاد کی پرورش کا بنیادی مقصد معاشی کارکن پیدا کرنا نہیں بلکہ انھیں معاشرے کے لیے فعال، متقی، مومن اور متحرک کارکن بنانا ہے۔ صلۂ رحمی کا مطلب محض معاشی ضروریات پورا کرنا نہیں بلکہ فکر، تعلق، محبت، رشتہ اور نصیحت پر مبنی خاندان کا قیام ہے۔ یہاں کوئی ایسی واضح لکیر نہیں کھینچی جاسکتی کہ ۱۶ یا ۱۸ سال کے بعد والدین پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں رہی اور نہ اس کی ضد کو درست سمجھا جاسکتا ہے کہ ۱۸ سال تک والدین سے استفادے کے بعد اب ہر کمایا جانے والا روپیہ اولاد کی 'ذاتی ملکیت' ہے۔ اسلامی اجتماعیت نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتی ہے اور نہ اشتراکیت زدہ ہے۔ اس کا اپنا مزاج اور اپنی اقدار ہیں۔

ہمارے معاشرے میں لازماً بڑی اولاد سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ پورے گھر کا بوجھ اٹھائے جو درست نہیں ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ پہلے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، پھر اعلیٰ ملازمت اختیار کرے اور اس کے بعد کہیں نکاح پر غور کیا جائے۔ اسلامی معاشرت کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے اور قرآن نے صاف کہا ہے کہ تم میں جو مجرد ہوں ان کے نکاح کردو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے لیے وسائل پیدا کردے گا۔ یہی بات اُس حدیث میں فرمائی گئی ہے جو آپ نے نقل کی ہے کہ اگر ایک نکاح کے بعد ایک شخص کو کشادگی حاصل نہیں ہوتی تو وہ مزید نکاح کرسکتا ہے۔

تکمیلِ تعلیم کو کبھی بھی نکاح کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ عصمت و کردار کا تحفظ ہر چیز پر بھاری ہے۔ اس لیے بلوغ کے بعد، یعنی اپنے اچھے برے کی عقل آنے پر نکاح کر دینا انتظار کرتے رہنے سے لازماً افضل ہے۔

بلوغ میں جسمانی اور ذہنی دونوں پہلو شامل ہیں اور اس کے لیے کسی عمر کی قید لگانا ایک غیرفطری عمل ہے۔ بعض خِطوں میں لڑکے اور لڑکیاں جلد جسمانی اور ذہنی طور پر بالغ ہوجاتے ہیں

بعض میں تاخیر سے۔ آج کے معلوماتی اور انقلابی دور میں ذہنی بلوغ جسمانی بلوغ سے بہت پہلے آجاتا ہے۔ اس لیے جسمانی بلوغ کے بعد نکاح کی فکر ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں بن سکتا کہ جس کا نکاح ہو جائے وہ لازماً معاشی طور پر خود کفیل بھی ہو۔ اگر والدین ایک وسیع خاندان میں رہتے ہیں تو گھر میں ایک فرد کے اضافے سے کوئی قیامت نہیں آجاتی۔ اس کے ساتھ اولاد پر بھی یہ غور کرنا فرض ہے کہ وہ کب تک بغیر کوئی کام کیے اپنے والدین کے سہارے رہے۔ گویا یہ ایک باہمی غور و فکر اور باہمی محبت و تعلق کا معاملہ ہے۔ اسے خالص قانونی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پاکستان کے قانون میں ۱۸ سال کی عمر لڑکے کے لیے اور ۱۶ سال کی عمر لڑکی کے لیے جو متعین کی گئی ہے یہ غیر عقلی، غیر عملی اور غیر شرعی ہے۔ بلوغت کے لیے عمر کی اس حد کو اس وقت دیکھا جاتا ہے جب بلوغت کے آثار ظاہر نہ ہوں۔

استطاعت کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ اضافی ہوگی اور ایک خاندان اور فرد کے معیارِ زندگی، ضروریات و مطالبات کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوگی۔ ہاں، اسے عدل، توازن، قسط اور میانہ روی کے تابع ہونا چاہیے۔ جو شخص استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے لیے اسلامی ریاست کو (وہ جب بھی قائم ہو) پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس کے نکاح اور متعلقہ ضروریات کا بندوبست کرے۔ ان شاء اللہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد نوجوانوں کو محض اس بنا پر روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ البتہ روزہ رکھنے کا مقصد نفس کو لگام دینا ہے اور یہ لگام دن میں روزے اور رات کو نوافل سے ہی دی جاسکتی ہے۔ خیال رہے کہ اسلام نے نکاح کو بہت آسان بنایا ہے۔ چند گواہوں کی موجودگی میں حسبِ استطاعت حق مہر اور ولیمہ سے یہ فریضہ بآسانی ادا کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے معاشرتی رسوم و رواج کے پیش نظر خود اس کو بوجھل اور مشکل بنایا ہے۔

تیسری بات آپ نے یہ اٹھائی ہے کہ آج کے معاشرے میں جہاں فحاشی و عریانی ایک نوجوان کے جذبات کو متاثر کرتی ہے، اگر کوئی ناجائز جنسی عمل سے بچنے کے لیے موسیقی یا فلموں سے شوق کر لے تو کیا گناہ کا مرتکب ہوگا؟ یہ سوال بہت معصومانہ ہے۔ موسیقی اور فلم، وڈیو یا نیٹ پر موجود بے شمار تفریحی پروگرام جنسی بے راہ روی کی طرف لے جانے کا غیر معمولی مؤثر ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے آپ کس طرح بڑی برائی سے بچ سکتے ہیں۔ یہ تو اس کی ترغیب دینے والے عوامل ہیں۔

اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے کہ زندگی کسی اعلیٰ مقصد کے تحت گزاری جانی چاہیے۔ لوگ محض دنیوی کیریئر بنانے کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دیتے ہیں، خواہشات کا خون کرتے ہیں اور کتنی محنت اور جدوجہد کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کے سامنے آخرت میں سرخروئی، نبی کریمؐ کا مشن، غلبۂ دین، نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا اور اسلامی انقلاب جیسے عظیم مقاصد ہوتے ہیں۔ اگر ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے، اپنے آپ کو سرگرم رکھا جائے تو بھی انسان نفسانی خواہشات کے غلبے اور شیطانی وساوس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر، اس کی یاد، اس کی محبت اور اس کی ناراضی کا خوف ہی وہ ڈھال ہے جو ایک نوجوان کو بے راہ روی سے بچا سکتی ہے۔ اس بنا پر صادق الامین علیہ السلام نے صوم کی تلقین فرمائی کہ اس میں انسان اپنے رب سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور اپنے تمام جسم کو بشمول ذہن و روح کو اپنے رب کی بندگی میں دے دیتا ہے اور اس طرح ایک مثبت عمل کے نتیجے میں شیطان کے حملوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ وساوس، جنسی ترغیبات، خیالی بے راہ روی، غرض وہ سب اعمال جو برائی کی طرف لے جانے والے ہیں، صوم کی وجہ سے انسان ان سب سے بچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجانا خود برائی سے بچ جانے کی ضمانت ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

ایک سے زائد حج

معاشرے میں نفلی حج کا رواج فیشن اور دکھاوے کے طور پر بھی بڑھ رہا ہے، اس حوالے سے علامہ یوسف قرضاوی کی ایک تحریر پیش کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

وہ شخص جو اسلام کی ترجیحات سے واقف ہو اور ہر چیز کے درست مقام کا علم رکھتا ہو، کبھی ان ترجیحات کے سلسلے میں شک و شبہے کا شکار نہیں ہوگا جن کا لحاظ کرنا ناگزیر ہے۔ میں کئی برسوں سے اسی کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ اسے میں نے 'فقہ ترجیحی' کا نام دیا ہے۔

ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام نے ہمیں جن چیزوں کا مکلف بنایا ہے، وہ ایک درجے کی نہیں ہیں، بلکہ ہر عمل کا الگ الگ درجہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ایمان